Edited

109173

بطرس

بطِ مے

Maii
Bat-e-Mein

عدم

Adam
Edum
Adem, Abdul Hamid
Bat.

الف

○ کتاب گھر امرتسر ○

10 TS

ضروری اور قانونی

ہندوستان بھر کے لئے اس کتاب کے حقوق اشاعت کتاب گھر امرتسر کے نام محفوظ ہیں لہٰذا کوئی صاحب قانون شکنی کرنے کی جسارت نہ کرے۔

تعداد ایک ہزار

اپریل ۱۹۵۷ء　　　بار دوم

قیمت　　　دو روپے چار آنے

CHECKED

cat ✓

K UNIVERSITY LIB
Acc No. 109173
Date 17. 2. 76

ST 01
1M

پبلشر: گیان سنگھ گرو ورنے راما آرٹ پریس سنتوکھ سر امرتسر میں باہتمام لالہ رام ناتھ پرنٹر سے چھپوا کر کتاب گھر کٹڑہ شیر سنگھ امرتسر سے شائع کیا

Allama Iqbal Library
109173

دل ساز نہ بن جائیں، لب جام نہ ہو جائیں
یہ پیار فزوں ہو کر بدنام نہ ہو جائیں

صرف ایک نظر تیری درکار ہے موسم کو
ورنہ یہ گل و غنچہ گلفام نہ ہو جائیں

یہ میری مناجاتیں، افراطِ عقیدت سے
یارب مجھے کھٹکا ہے، اصنام نہ ہو جائیں

تخفیف مراسم میں اسرار گرو لیکن!
لوگوں کے جو دعوے ہیں، الہام نہ ہو جائیں

اک بنتِ زلیخا نو، در پے ہے ہمارے بھی
یوسف کی طرح ہم بھی، نیلام نہ ہو جائیں

دیکھا ہی نہیں اُس نے، اِس سمت عدم ورنہ
سب زخم نہ بھر جائیں، سب کام نہ ہو جائیں

اب ذہن میں مت لاؤ، اب یاد نہ فرماؤ
بھولے ہوئے یاروں پر، بیداد نہ فرماؤ

سرکار کے مقصد کو، ہم خوب سمجھتے ہیں
اس حُسنِ تجاہل سے، ارشاد نہ فرماؤ

آنکھوں کو ضرورت سے، زائد نہ کرو بےخود
مدہوش غزالوں کو، آزاد نہ فرماؤ

امداد کو میں اپنی توہین سمجھتا ہوں
اے اہلِ کرم میری امداد نہ فرماؤ

مے خانے کا دروازہ ہے بند عدم صاحب
اب اور کوئی حیلہ ایجاد نہ فرماؤ

وہ جو اُس آنکھ کی کہانی ہے
لہر ہے، گیت ہے جوانی ہے

غم اگر دل کو راس آ جائے
شادمانی ہی شادمانی ہے

حادثہ ہے کہ تیری آنکھ کا بھی
رنگ اے دوست آسمانی ہے

ہائے تقدیر اُن نگاہوں کی
جن کا ٹھہراؤ بھی روانی ہے

کیسا پُر لطف ہے یہ ہنگامہ
کیسی دلچسپ زندگانی ہے

جو الم ہے وہ اتفاقی ہے
جو خوشی ہے وہ ناگہانی ہے

آؤ پھولوں کی آگ پی جاؤ
دورِ صہبائے ارغوانی ہے

دیکھنا زرد بیل کی جانب
جیسے کوئی اُداس رانی ہے

رنج سے عشق شعلہ ہے
شرم سے عقل پانی پانی ہے

ہائے کس ڈھب کی بات ہوتی ہے
گیسو و لب کی بات ہوتی ہے

جانِ من کب کا ذکر کرتے ہو
جانِ من کب کی بات ہوتی ہے

آپ اکثر جو ہم سے کرتے ہیں
وہ تو مطلب کی بات ہوتی ہے

آؤ تھوڑا سا نور لے جاؤ
ماہ و کوکب کی بات ہوتی ہے

جب بھی ہوتا ہے دل کا ذکر عدمؔ
ساتھ ہی شب کی بات ہوتی ہے

•

چمن طراز یہ نوکِ خدنگ ہوتی ہے
ہر ایک دل میں خوشی کی اُمنگ ہوتی ہے

حباب ٹوٹتا ہے جب وفورِ مستی سے
بلند اُس سے بھی آوازِ چنگ ہوتی ہے

مشاہدے کا بھی اک اپنا حُسن ہے ساقی
نظر بھی اپنی جگہ موجِ رنگ ہوتی ہے

خدا تو ہے مگر اس مصلحت سے ہے غائب
کہ اُس کو دیکھ کے مخلوق دنگ ہوتی ہے

تو ان کی بات نہ سُن تجربہ برت اپنا
قلندروں کی تو ساقی ترنگ ہوتی ہے

بہار آئے اگر بے تکلفی سے عدم
تو کتنی دلکش و شفاف رنگ ہوتی ہے

بڑی تڑپ بڑے ہیجان سے صدا آئی
یہ کس اُداس بیابان سے صدا آئی

کوئی پری کہیں رستہ بھٹک گئی ہوگی
جو آج کوہ سلیمان سے صدا آئی

شفق سے نکلی تھی شیشے میں ہوگئی داخل
غرض یہ ہے بڑی پہچان سے صدا آئی

صدا کنارے سے آتی حسیں نہیں آتی
مرا خیال ہے طوفان سے صدا آئی

حریمِ طور سے آتی نہ تھی صدا پہلے!
مگر جب آئی تو کس شان سے صدا آئی

گھِرا میں جب بھی عدم مشکلاتِ ہستی میں
عجیب عالمِ امکان سے صدا آئی!

ذہن گلزار ہو گیا ہوگا
باغباں یار ہو گیا ہوگا

بات سرکار بن گئی ہوگی
کام سرکار ہو گیا ہوگا

پھول اس زلف سے جدا ہوکر
سخت بیمار ہو گیا ہوگا

قافلہ اب نظر نہیں آتا
تیز رفتار ہو گیا ہوگا

لوٹتا کب تھا قیس گھبرا کر
شہر بیدار ہو گیا ہوگا

ایک ارماں تو تھا عدم دل میں
سوکھ کر خار ہو گیا ہوگا

کوئی تدبیر کام میں لاؤ
دلکشی صبح و شام میں لاؤ

یہ غزال اتنے ہوشیار نہیں
ان غزالوں کو دام میں لاؤ

آج تلخی بہت زیادہ ہے
ڈال کر زہر جام میں لاؤ

جل گیا عشق، مر گئے عاشق
اب تو خنجر نیام میں لاؤ

اے عدم شہر کے عمائد کو
ورغلا کر عوام میں لاؤ

دیر و حرم سے بدظن ہو کر اہلِ نظر لوٹ آئے ہیں !!!
کچھ جنگل میں بیٹھ رہے ہیں اور کچھ گھر لوٹ آئے ہیں

بے مقصد گردش کا یہی انجام ہمیشہ ہوتا ہے
چاک گریباں جو نکلے تھے خاک بسر لوٹ آئے ہیں

ساز و سبو کے ساتھ ہی رخصت شمس و قمر نے مانگی تھی
ساز و سبو کے ساتھ ہی ساقی شمس و قمر لوٹ آئے ہیں

کشتی کا اور موجوں کا یارانہ کچا نکلا ہے
کشتی گھاٹ پہ جا اتری ہے اور بھنور لوٹ آئے ہیں

اس نے عدم ارشاد کیا ہے جب بھی مجھے کچھ کہنے کا
طرز طریقے جھوم اٹھے ہیں فن و ہنر لوٹ آئے ہیں

اخلاص سے ملنے والوں کے اطوار نرالے ہوتے ہیں !!

باتوں میں حلاوت ہوتی ہے آنکھوں میں اجالے ہوتے ہیں

اللہ غنی کیا لطف آتا ہے ہم کل کی صحبت کا

وہ بال بکھیرے ہوتے ہیں ، ہم جام سنبھالے ہوتے ہیں

پروا ، نہ کرے انسان تو کیا کہنا ہے حوادث کی رو نے ؟

یہ غم تو بشر کے ہاتھوں نے خود آپ ہی پالے ہوتے ہیں

مت پوچھ حسینوں کی چنچل گلبار آنکھوں کا عالم

کچھ ایسا تصور ہے جیسے موجوں کے اچھالے ہوتے ہیں

ہم اہل نظر کرتے ہیں عدم تعظیم حسینوں کی دل سے

وہ اور صراحی ہوتی ہے ، وہ اور پیالے ہوتے ہیں

○

حسینو! سدا مسکراتے رہو
دلوں کے شگوفے کھلاتے رہو

مجھے بھی عقیدت ہے تم سے بہت
مرے پاس بھی آتے جاتے رہو

تعلق نہیں اب تو پھر کیا ہوا
نگاہیں تو یارو ملاتے رہو

فقیروں کی خدمت بڑی چیز ہے
فقیروں کو امرت پلاتے رہو

زمانے کو روتا ہوا دیکھ کر
بڑے شوق سے مسکراتے رہو

چلو کام تو مستقل مل گیا
سفینے کو ساحل پہ لاتے رہو

ارے جگمگاتے ہوئے پیکرو!
یونہی دیر تک جگمگاتے رہو

کہانی بڑی لطف انگیز ہے
میں سنتا رہوں تم سناتے رہو

ابھی چاندنی رات ہے باغ میں
ستاروں کے بربط بجاتے رہو

کوئی کام مشکل نہیں دہر میں
عدم دشمنوں کو مناتے رہو

گلوں کے بدن پر لبادہ نہیں / بہاروں کا مسلک کشادہ نہیں

مجھے صرف دیدار کا شوق ہے / محبت کا کوئی ارادہ نہیں

ذرا دیکھنا سرو کو باغ میں / کہ جیسے کوئی شاہ زادہ نہیں

تری آنکھ ہی کو کوئی دیکھ لے / کسے رغبتِ جام و بادہ نہیں

چلو سیر کر آئیں گلزار کی / ہوا میں حرارت زیادہ نہیں

لکیریں پڑی ہیں ہر اک برگ پر / ورق کوئی گلشن میں سادہ نہیں

مرے پاس آنے سے مت جھینپیے / مجھے خواہشِ استفادہ نہیں

کہیں پھنس نہ جانا عدمؔ دام میں
سخن اُن کا اتنا بھی سادہ نہیں

یہ کیسے بانکے غزال ہیں، اِس طرح جو جادو جگا رہے ہیں
غلط غلط پاؤں دھر رہے ہیں، سجا سجا گام اُٹھا رہے ہیں
مشاہدے کا جمال ہے یہ کہ التفاتِ خیال ہے یہ
جدھر بھی اُٹھتی ہے آنکھ میری کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں
وہ ایسے وارد ہوئے ہیں دل میں کہ بن گئے ہیں سکون دل کا
بنا لیا ہے یہیں ٹھکانہ، نہ آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں
یہ چھیڑ دیکھیں کہاں پہنچ کر سکون لیتی ہے گلستاں میں
بہار صہبا چھڑک رہی ہے، نگار دامن بچھا رہے ہیں
ملی ہیں آنکھیں کہ گفتگو کا طویل آغاز ہو گیا ہے!
میں اُن کو باتیں سُنا رہا ہوں، وہ مجھ کو باتیں سُنا رہے ہیں
شراب تو پی نہیں مگر حال کس لئے ہے شرابیوں کا
نگاہ سنگیت بن رہی ہے، حواس بربط بجا رہے ہیں
نوا کی لہریں بڑے تکلّف سے رنگ کے جال بُن رہی ہیں
صبا کے جھونکے بڑی لگن سے نئے شگوفے کھلا رہے ہیں

بڑی حسین بجلیاں جوانی کی رنگ رلیاں منا رہی ہیں
بڑے نشیمن فروز شعلے نظر کے رستے میں آ رہے ہیں

تری نظر سے مرے خیالوں میں شور ایسا مچا ہوا ہے
کہ جیسے لاکھوں طیور ساقی جلا کے آواز گا رہے ہیں

چلو عقائد کی ظلمتوں کو یقیں کے چشمے میں غرق کر دیں
نئے پجاری صنم کدے میں چراغ بادہ جلا رہے ہیں

اب اس سے بہتر سفر کی کلفت کا کیا مناسب علاج ہوگا
حسین رہزن بڑی محبّت سے رہرووں کو بُلا رہے ہیں

مجھے یہ کل رات خواب آیا ہے اے نجومی کہ فصلِ گُل میں
وہ مجھ کو آغوش میں لئے چاند کا سفینہ چلا رہے ہیں

فضائیں رنگیں کہانیوں کا نگار خانہ کھلا ہوا ہے!
ہوا کے سازوں پہ داستاں گو لطیف قصّے سُنا رہے ہیں

عدم پُرانے قدح کشوں سے کہو کہ اب اپنی راہ پکڑیں
کہ بزم میں اپنے جام لیکر جواں جواں لوگ آ رہے ہیں

K. UNIVERSITY
Accession No. 109173

فقیر کس درجہ شاد ماں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا
حضور کس درجہ مہرباں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

وہ مے کدہ تھا صنم کدہ تھا، کہ باب جنت کھلے ہوئے تھے
تمام شب آپ ہم کہاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

وہاں بہاروں کے زمزمے تھے، وہاں نگاروں کے جمگھٹے تھے
وہاں ستاروں کے کارواں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

پہن کے پھولوں کے تاج سر پہ حسین شاداب مسندوں پہ
سبو بکف کون حکمراں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

مراحلِ راحت و اماں تھے، مسائلِ ماہ و کہکشاں تھے
مشاغلِ حرف و داستاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

اگرچہ شوق و طلب تھے بیاختہ ہم آغوشیوں پہ مائل
کئی تکلف بھی درمیاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

لطیف شامیں طبیعتوں کے ضمیر سے خوب آشنا تھیں
حسین سویرے مزاج داں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

نظر کی حد تک محیط تھا سلسلہ مہکتے ہوئے گلوں کا
گلوں میں پریوں کے گھر نہاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

عجیب سانچے کی کشتیاں بہ رہی تھیں لہروں کے زیر و بم پر
عجیب صورت کے بادباں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

الوہیت آپ اس حسین اتفاق پر مسکرا رہی تھی
صنم خداؤں کے مہماں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

جو واقعے تھے وہ گونجتے زمزموں کی مانند موجزن تھے
جو خواب تھے سرِ بوستاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

کہیں کہیں سلسبیل و کوثر کی جوت موجود تھی زمیں پر
کہیں کہیں عرش و آسماں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

شبِ محبت حضور کی نا کلیوں کے کھلنے کے سلسلے میں
عدم کے اصرار کیا جواں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

•

مہ جبیں کس ادا سے چلتے ہیں
دلنشیں دلربا سے چلتے ہیں

بات اُس کے کرم سے بنتی ہے
کام اُس کی رضا سے چلتے ہیں

پھول کتنے بھی سُرخ ہوں پھر بھی
اُس کے رنگِ قبا سے چلتے ہیں

آؤ جاں ڈال دو مشاغل میں
ورنہ کچھ بے مزا سے چلتے ہیں

ہیں کچھ ایسے بھی بادباں جو عدمؔ
ناموافق ہوا سے چلتے ہیں

○

غمِ محبت کی عید ہے شاید
اُن کے خط کی رسید ہے شاید

جو نئے پیرہن میں آئی ہے
یہ پرانی امید ہے شاید

رات دیکھا تھا ماہِ نو ہم نے
آج یومِ سعید ہے شاید

وہ جفا سے بھی دستکش ہیں اب
یہ عتابِ جدید ہے شاید

شیخ کی جیب میں عدمؔ صاحب
میکدے کی کلید ہے شاید

نہ دیوانوں کو کہتے ہیں، نہ فرزانوں کو کہتے ہیں
مری سرکار ہم انسان انسانوں کو کہتے ہیں

اسے تشبیہہ کیوں دیتے ہو نیکی اور طہارت سے
جوانی تو شراب آلود ارمانوں کو کہتے ہیں

بڑی توہین مہمانوں کی ہے اس نام میں پنہاں
بلائے ناگہاں کیوں لوگ مہمانوں کو کہتے ہیں

کنارا گو کنارے ہی کو کہنا چاہیے تاہم
کچھ ایسے زندہ دل بھی ہیں جو طوفانوں کو کہتے ہیں

وہ قفلِ باب ہی کیا ٹوٹ جائے جو سہولت سے
حقیقی قفلِ دروازہ تو دربانوں کو کہتے ہیں

چمن کی پُر تکلف رونقیں بھی دیکھ لیں ہم نے
گلستاں بھی عدمؔ شاداب ویرانوں کو کہتے ہیں

ذرا انگڑائی لو اور بتکدے تعمیر کر ڈالو
خطوطِ جسم سے تاریخِ گل تحریر کر ڈالو

مجھے رسوائیاں معیارِ حق معلوم ہوتی ہیں
مری عزّت اسی میں ہے، مری تشہیر کر ڈالو

مرے فردِ عمل کو لکھنے والو! مطمئن ہوں میں
جو چاہو اپنے انداز سے تم تحریر کر ڈالو

بہک جاتے ہیں اکثر لوگ لہجے کی فصاحت سے
کوئی دلچسپ سی سُلجھی ہوئی تقریر کر ڈالو

محبت کس کو کہتے ہیں، صداقت کس کو کہتے ہیں
نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر تفسیر کر ڈالو

مرے شیشے کو گر ہونٹوں سے تم کرتے نہیں اصل
مرے شیشے پہ اپنا نام ہی تحریر کر ڈالو

عدمؔ مکتوب لکھتے وقت دل کو ضبط میں رکھنا
کہیں ایسا نہ ہو کچھ اور ہی تحریر کر ڈالو

مکرر وہی بات ہو جائے گی
خرابات میں رات ہو جائے گی

ذرا گیسوؤں کو جھٹک دیجیے
ستاروں کی برسات ہو جائے گی

بتوں کے ذریعے سے کیا علم تھا
خدا سے ملاقات ہو جائے گی

مری ذات تحقیق کرتے ہوئے
اچانک تری ذات ہو جائے گی

کبھی آپ حیران ہو جائیں گے
کسی دن کرامات ہو جائے گی

ذرا سا تغافل ہوا تو عدمؔ
وہی شکلِ حالات ہو جائے گی

اُداسی سے زلفیں نہ بکھرائیے
جو ارشاد کرنا ہے فرمائیے

اندھیرا زیادہ نہ ہو راہ میں
ستاروں کو ہمراہ لے جائیے!

ہر اک عارضہ دُور ہو جائیگا
مرا مشورہ کام میں لائیے

ابھی رنگ ماحول کا ٹھیک ہے
خراماں خراماں گزر جائیے

کِیا کیا ہے سرکار ہم نے ابھی
کوئی اور ارشاد فرمائیے

عدمؔ دیکھ کر زندگی کا سلوک
یہی جی میں آتا ہے مر جائیے

کس شاہدِ جمیل کی تعریف کیجئے!
فرصت ملے تو کاوشِ تصنیف کیجئے

دُنیا تو کر رہی ہے بہت ہم پہ اعتنا
سرکار آپ بھی ذرا تکلیف کیجئے

مجنوں کا نام آئے حکایت میں کس لئے
تھوڑی سی واقعات میں تحریف کیجئے

اوصاف کی صفت ہی اگر کی تو لطف کیا
خوبی تو جب ہے عیب کی توصیف کیجئے

تکلیف بھی ہے اب تو تکلف صفت عدم
اب کیا تکلفات کی تکلیف کیجئے

•

اے حُسنِ خود پسند کوئی غیر تو نہیں
ہم ہیں نیاز مند کوئی غیر تو نہیں

کیوں کھولتے نہیں درِ میخانہ مُغبچو
ہیں بادہ نوش چند کوئی غیر تو نہیں

ہم کھٹکھٹا رہے ہیں ترے در کو اے صنم
کیوں ہے کواڑ بند کوئی غیر تو نہیں

ہم پر کمند ڈال بڑے اشتیاق سے
ہم صاحبِ کمند! کوئی غیر تو نہیں

گیسو ترا دراز ہماری صدا بھی سُن
رتبہ ترا بلند، کوئی غیر تو نہیں

ہم آرہے ہیں تیرے تعاقب میں اے عدمؔ
کر تیز مت سمند، کوئی غیر تو نہیں

○

کب اُٹھے گا حجابِ معنیٔ ساز
کس جگہ گم ہے زمزمہ پرداز

ساز تحلیل ہو گیا نَے میں
مٹ گیا امتیازِ نغمہ و ساز

ہنس دیئے وہ مرے گریباں پر
موسمِ گل کا ہو گیا آغاز

اللہ اللہ ! اُس کی انگڑائی
سنگِ مرمر کی کوششِ پرواز

روشنی یوں ہے ذہن میں جیسے
پڑھ رہا ہو کوئی حسین نماز

کر رہے ہیں وہ مست آنکھوں سے
اِس طرح رسم و راہ کا آغاز

جس طرح میکدے کا دروازہ
موسمِ گل میں ہو رہا ہو باز

پر شکستہ طیور بھی مائل
کر گئے دل کے زور پر پرواز

میں کہاں سے کہاں چلا آیا
آئی تھی کس حسین کی آواز

جنبشِ لب کی اب اجازت دے
جاں بلب ہے تمام محفلِ راز

دل ہے وہ طفلِ سادہ لوحِ عدم
جس کا مذہب ہے صدق و شوق و نیاز

دھیان رکھیں نہ آپ جوبن کا
میں محافظ ہوں آپ کے دھن کا

وہ لبادے اُڑے نقاروں کے
وہ بہار آئی، وہ سبُو کھنکا!

کس نے زلفیں بکھیر دیں اپنی
رُوپ گدرا گیا ہے گلشن کا

رنگ پھولوں کے پڑ گئے مدھم
ماتھا کس گل فروش کا ٹھنکا

کاٹ دو آج ضد مشیت کی
توڑ دو آج سانپ کا منکا

کاش کوئی غزال آ جائے
سرد ہے کاروبار گلشن کا

حُسن اگر انتہا ہے غمزے کی
عاشقی بھی کمال ہے فن کا

ایسے بیٹھے ہیں وہ اُداس عدمؔ
چاند تنہا ہو جس طرح بَن کا

فرزانے بن گئے ہیں نادان ہو گئے ہیں
ہم تیری سادگی پر قربان ہو گئے ہیں

وہ درد بھی ملے ہیں اُس آنکھ سے ہمیں جو
ہر دردِ زندگی کا درمان ہو گئے ہیں

یارو کہیں سے لاؤ ہنستی جوانیوں کو!
یارو! دِلوں کے قریے ویران ہو گئے ہیں

چھڑکا ہے رنگ ایسا اُس پُرفسوں نظر نے
کانٹے مشاہدوں کے رُومان ہو گئے ہیں

کس حُسنِ دلبری سے شمعیں ہوئی ہیں روشن!
پروانے کس ادا سے قربان ہو گئے ہیں

آ کر ملے ہیں وہ کچھ اِس پیار سے عدم کو
اُن کے مزاج داں بھی حیران ہو گئے ہیں

راز اِس طرح دِلوں کے مشہور ہو گئے ہیں
ہم عرضِ مدّعا پر مجبور ہو گئے ہیں

دِل میں کمی کچھ ایسے محسوس ہو رہی ہے
نزدیک آ کے جیسے وہ دُور ہو گئے ہیں

اتنی عقیدتوں سے پیش آئی ہے محبت
حُسن و جمال والے مغرور ہو گئے ہیں

سوجھی ہے کیا نہ جانے ناداں مشاہدوں کو
کچھ رنگ بن گئے ہیں۔ کچھ نور ہو گئے ہیں

کیا دلکشی عدمؔ تھی دار و رسن میں پنہاں!
جو صاحبِ نظر تھے منصور ہو گئے ہیں

جہاں راستے آپ بھی تھم سے گئے ہیں
وہاں تک مسافر بہت کم گئے ہیں

کریں کس مربّی سے اے دوست شکوہ
محبت بھرے خون ہی جم گئے ہیں

خدا اُن کی زلفوں کو شاداب رکھے
وہ ہو کر بہت آج برہم گئے ہیں

زیادہ نہیں طور سے واقفیت
وہاں صرف اک مرتبہ ہم گئے ہیں

وہاں تک مری الجھنیں خوشنما ہیں
جہاں تک تری زلف کے خم گئے ہیں

وہ گل کی قبا میں ہوئے ہیں عیاں جب
تو اہلِ ہوس بن کے شبنم گئے ہیں

مرا یار اور میں عدم اتفاقاً
خرابات تک آج باہم گئے ہیں

نظر کا ذرا سا زیاں ہو گیا ہے
ستارہ افق میں نہاں ہو گیا ہے

ہمیں زخم کھانے کی خو تو نہیں تھی
انھیں شوقِ تیر و کماں ہو گیا ہے

چھپایا تھا ہم نے جسے آپ سے بھی
وہی راز اب داستاں ہو گیا ہے

ادھر کس لیے زلف بکھرا رہے ہو
ادھر دیکھیے کیا سماں ہو گیا ہے

وہ جھونکا جو آیا تھا غرقاب کرنے
مری ناؤ کا بادباں ہو گیا ہے

وہ سفاک اتنی کشادہ دلی سے
نہ معلوم کیوں مہرباں ہو گیا ہے

عدم ہم کو اس نے دیا رنج تو کیا
زمانہ تو کچھ شادماں ہو گیا ہے

تری نگاہ میں بھی رنگِ التفات نہیں
یہ بات کیا مری بدقسمتی کی بات نہیں

مجھے حیات کا الزام دیجئے نہ ابھی
میں جی رہا ہوں مگر مجرمِ حیات نہیں

مرے سخن پہ توجہ نہ کر بہت ساقی!
خطا معاف تری انکھڑیوں کی بات نہیں

میں تیری ذات کو وجدان میں تو پاتا ہوں
اگرچہ میری رسائی میں تیری ذات نہیں

یہ کس جگہ ہمیں لے آئی ہے حیات عدمؔ
یہ کائنات تو کچھ ایسی کائنات نہیں

خموشی ساز امینِ سخن بھی ہوتے ہیں — بہار آئے تو یہ موجزن بھی ہوتے ہیں

تکلفات میں تکلیف ہی نہیں ہوتی — تکلفات میں کچھ بانکپن بھی ہوتے ہیں

کلیم جا تو سہی تجربہ تو کر جاکر — سُنا ہے میں نے کہ وہ ہم سخن بھی ہوتے ہیں

کسی کی زلفِ مسلسل میں کیا نہیں ہوتا — نسیم و غنچہ بھی سرو و سمن بھی ہوتے ہیں

دلوں پہ برق کوئی ایک تو نہیں گرتی — نظر کے ساتھ خطوطِ بدن بھی ہوتے ہیں

مجھے پسند ہے میخانہ اس لئے کہ وہاں — ستارہ پوش بھی گلِ پیرہن بھی ہوتے ہیں

یہاں تو کچھ بھی نہیں چند تاجروں کے سوا — سُنا تھا میں نے یہاں کوہکن بھی ہوتے ہیں

یہ ٹھیک ہے تو بڑا شکر ہے خدا کا عدمؔ

سُنا ہے راہ میں کچھ راہزن بھی ہوتے ہیں

شیشے ایسے چُور ہوتے ہیں
سب اندیشے دُور ہوتے ہیں

اب ہم سے ناراض نہ ہونا
ہم بھی کچھ مجبور ہوتے ہیں

حیرت کی کیا بات ہے اس میں
مے پی ہے مخمور ہوتے ہیں

کیا سیدھی سی بات تھی لیکن
کیا اُلٹے دستور ہوتے ہیں

فردِ عمل لکھنے کی خاطر
دو کاتب معمور ہوتے ہیں

پہلے ہی رکھنی تھی خبر کچھ
اب وہ کیوں رنجور ہوتے ہیں

ایک تھا مجنوں ایک تھا وامق
کیا قِصّے مشہور ہوتے ہیں

آج قدم ٹوٹے ہوئے بربط
نغموں سے معمور ہوتے ہیں

کیا عہد و پیماں ہوتے ہیں — پروانے قرباں ہوتے ہیں
تم کو کیوں حیرت ہے اتنی! — ہم یونہی قرباں ہوتے ہیں
سمجھاتے ہیں دیوانوں کو — فرزانے ناداں ہوتے ہیں
پھر تصویریں بول اٹھی ہیں — پھر زندہ ارماں ہوتے ہیں
مرنے کے رنگین ارادے — جینے کا ساماں ہوتے ہیں
کیا سچی تسکین ملی ہے — کیا موزوں ارماں ہوتے ہیں

عقل عدم حیران ہے کیسر!
کچھ ایسے عرفاں ہوتے ہیں

○

اک خموشی ہے کہ سکتے کی طرح طاری ہے
آج کی شام طبیعت پہ بہت بھاری ہے

حوضِ کوثر میں ہو تلخی بھی ذرا سی یارب
ہم فقیروں کو ذرا عادتِ میخواری ہے

دشمنی بندوں سے، یزداں سے عقیدت اتنی
حضرتِ شیخ یہ کس نوع کی عیاری ہے

جس کو کہتے ہیں، طمانیتِ خاطر ساقی
وہ تو انساں کے خیالات کی ہمواری ہے

جا بجا پھولوں کے انبار سے لگے ہیں ہر سُو
ہائے کس زور کا ہنگامۂ گلباری ہے

ہم نے دیکھا نہیں خورشید سے شبنم کا ملاپ
ان سے ملنے میں ذرا سی ہمیں دشواری ہے

جو خسارہ ہے ۔ وہ وجدان کا خمیازہ ہے
جو اذیت ہے ۔ وہ احساس کی بیداری ہے

دل میں شیریں سی چبھن رہتی ہے ہر وقت عدمؔ
یہ نہیں علم ، یہ صحت ہے کہ بیماری ہے

○

رنگ ہے پھول کا مہتاب کا ہے نور یہاں ۔۔۔ کوئی نوخیز پری زاد ہے مستور یہاں
یہ مہکتے ہوئے جنگل یہ گلابی چشمے ۔۔۔ آپ کس واسطے یوں بیٹھے ہیں رنجور یہاں
تم پسِ پردہ رہو اتنا بتا دو لیکن ۔۔۔ ہونے والا تو نہیں حادثۂ طور یہاں
یہ خرابات ہے مسلک ہے یہاں کا شیشہ ۔۔۔ چل نہیں سکتا کوئی دوسرا دستور یہاں
مختلف ہیں یہاں آدابِ چمن اے مالی ۔۔۔ پھول کو خاطرِ گلچیں نہیں منظور یہاں
شہرِ شیریں نہیں فرہادِ مغاں کی بستی ۔۔۔ لیکے اُٹھتے ہیں جھلہ شام کو مزدور یہاں

اپنے اپنے ہیں عدمؔ طرز طریقے سب کے
کوئی تسلیم و رضا پر نہیں مجبور یہاں

وہ جو برہم دکھائی دیتے ہیں — غنچہ و گل دہائی دیتے ہیں
ہائے لرزش کسی کے بالوں کی — مجھ کو نغمے سنائی دیتے ہیں
کیا نئی بات کی پتنگے نے — جاں عموماً فدائی دیتے ہیں
آہ و نالہ سے سود کیا ہوگا — اُن کو یہ کم سنائی دیتے ہیں
ناخن اُن کے ہیں یوں بھی تیز بہت — رنگ انھیں کیوں حنائی دیتے ہیں
رہزنوں سے ڈرو نہ اے یارو — ان کو رستے سجھائی دیتے ہیں

ایسے بجتے ہیں بعض ساز عدمؔ
جیسے زخمی دُہائی دیتے ہیں

ساز اور جام آ نہیں سکتے
کیا وہ ایام آ نہیں سکتے

پہلے آغاز ہی مقدّم ہیں
پہلے انجام آ نہیں سکتے

اب نہ صیّاد یہ تکلّف کر
ہم نہ دام آ نہیں سکتے

ہائے کیا شومیٔ مقدّر ہے
وہ مرے کام آ نہیں سکتے

اب وہ اصنام دُور ہیں ہم سے
اب وہ الزام آ نہیں سکتے

جب تک اُس کی نگاہ برہم ہو
دُور ہیں جام آ نہیں سکتے

ہم عدمؔ عین شب کو آئیں گے
ہم سرِ شام آ نہیں سکتے

جس چیز کا لے دو لہرا کر تم نام تمہاری دولت ہے
یہ ساز تمہاری بخشش ہے، یہ جام تمہاری دولت ہے

تکلیف میں بھی مسرور رہیں ہم آرام میں بھی مخمور رہیں ہم
تکلیف تمہاری رحمت ہے، آرام تمہاری دولت ہے

اب ہم کو خدا کا نام بھی لینے پر تعزیریں دیتے ہو
کیوں صاف نہیں کہہ دیتے، خدا کا نام تمہاری دولت ہے

ہم گردش دوراں سہتے ہیں آپ کو مل ہی لیتے ہیں
یہ صبح تمہاری ملکیت، یہ شام تمہاری دولت ہے

جو کچھ بھی عدم نے پایا ہے، مرے یارو تم سے پایا ہے
اخلاص تمہارا دریوزہ، اسلام تمہاری دولت ہے

آشائیں مہیا کرتے ہیں، ارمان بہم پہنچاتے ہیں
فنکار دِلوں کو راحت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں

ہم اُن سے کنارا کیسے کریں، یہ ظلم گوارا کیسے کریں
ہیں وہ ہی تو جو اس پیکر کو، کچھ جان بہم پہنچاتے ہیں

ساحل پہ لگے یا موجوں کی آغوش سے واصل ہو جائے
کشتی کو تسلی تو کچھ کچھ طوفان بہم پہنچاتے ہیں

کیا مانگئے اُن سے اے ہمدم جب حسبِ ضرورت اہلِ کرم
جس شے کی ضرورت ہوتی ہے ہر آن بہم پہنچاتے ہیں

آزردہ و غمگیں کیوں ہے عدم، ہے اہلِ طریقت کا یہ بھرم
جو درد عنایت کرتے ہیں، درمان بہم پہنچاتے ہیں

خلافِ رسوم و روایات کیجیے
کبھی زندگی سے ملاقات کیجیے

بڑی دھوم ہے آپ کے دم کرم کی
فقیروں کی کچھ تو مدارات کیجیے

میں تزئینِ حالات کو آ گیا ہوں
ذرا آپ اصلاحِ حالات کیجیے

کسی پر توجہ کسی سے تغافل
یہی کام سرکار دن رات کیجیے

بہاریں بھی ہیں ابر توبہ شکن بھی
چلو آج سیرِ خرافات کیجیے

بہ ہنگامِ موسمِ گل میں یہ سوچ کیجیے
کوئی شعر کہیے کوئی بات کیجیے

غزالِ چمن دے رہے ہیں سلامی
ہے سرکار کیا آپ کا نامِ نامی

ترے عہد میں کون زندہ رہیگا
شباب اور ساتھ اس کے شیریں کلامی

مرے پاس آتے ہیں ہر وقت پیاسے
ہے صحرا کا چشمہ مری نیک نامی

تری زلف کس رات کی پیشکش ہے
تری آنکھ ہے کس سحر کی پیامی

بڑی راحتیں ہیں اسیروں کو حاصل
بڑا قیمتی حادثہ ہے غلامی

ضرورت سے زائد ہی کچھ ڈھیل دیدی
عدمؔ شوق نے باگ دل کی نہ تھامی

وہ کس انداز سے ہم پہ نگاہِ ناز کرتے ہیں
کہ جیسے گانے والے گیت کا آغاز کرتے ہیں

جو پَر والے ہیں گر جاتے ہیں غش کھا کر خلاؤں میں
جو بے پَر ہیں فرازِ عرش تک پرواز کرتے ہیں

دلوں کی آگہی موسیقیوں میں ڈوب جاتی ہے
نگاہوں کو وہ جب آلودۂ پرواز کرتے ہیں

سحر کو میکدے میں سونے والے منچلے اکثر
بڑی مشکل سے دروازے کو اٹھ کر باز کرتے ہیں

جو جینے میں گنجائش ہی کیا تکلیف کی اُن سے
جو کرتے ہیں عدم انسان سے ہمراز کرتے ہیں

ہمیں توفیق ارزانی ہوئی ہے نور پاشی کی
تمہیں کس واسطے تشویش ہو تیرہ خواشی کی

جدھر جاتے ہیں تازہ مورتوں سے آنکھ لڑتی ہے
خدا کو یار عادت پڑ گئی ہے بت تراشی کی

سبو گم ہو گیا تھا رات میخانے میں اک ساقی
سحر کو محتسب نے شیخ کی جامہ تلاشی کی

کسی جانب سے کوئی مہ جبیں آنے ہی والا ہے
مجھے یاد آ رہی ہے آج متھرا اور کاشی کی

عدم چل باغباں سے کچھ شگفتہ پھول لے آئیں
گلوں سے جیب بھرنی ہے کسی خوش ذوق راشی کی

رُخ سے گیسو ہٹا کے بات کرو
مہ وشو جگمگا کے بات کرو

بات ہی کیا چٹک نہ ہو جس میں
جب کرو مسکرا کے بات کرو

دُور سے یہ ادا نہیں موزوں
یار نزدیک آ کے بات کرو

خشک باتیں بھلی نہیں لگتیں
دوستو پی پلا کے بات کرو

میں نہ کہتا تھا ظلم ٹھیک نہیں
سامنے اب خدا کے بات کرو

کیوں جھجکتے ہو بات کرنے سے
سامنے آؤ آ کے بات کرو

بتکدے کے چراغ مدھم ہیں
نوکِ ابرو ملا کے بات کرو

بات کا لطف گر اٹھانا ہے
مہوشوں کو سنا کے بات کرو

رِند یوں گفتگو نہیں کرتے
اے عدم جام اٹھا کے بات کرو

○

سانس پیغامِ یار بن جائے
بے قراری قرار بن جائے

یوں نظر ڈالیے کہ عہدِ خزاں
احتراماً بہار بن جائے

بدگمانی کا معجزہ یہ ہے
بدظنی اعتبار بن جائے

گردشِ جام کو اجازت ہے
گردشِ روزگار بن جائے

شمع کہہ دے تو خاکِ پروانہ
از سرِ نو شرار بن جائے

عقل اگر آئینے میں منہ دیکھے
وحشتِ خندہ بار بن جائے

اے عدم جس کو غم نہ ہو کوئی
وہ مرا غمگسار بن جائے

بے دلی سے دیوانے ایسے مسکرائے ہیں
عقل چیخ اٹھی ہے ہوش لڑکھڑائے ہیں

مدّعا کے جو ریزے رہ گئے تھے سینے میں
کچھ دلوں میں اٹکے ہیں کچھ لبوں تک آئے ہیں

آرزو کی پگڈنڈی اَٹ رہی ہے پھولوں سے
میکدوں کی راہوں میں آنچلوں کے سائے ہیں

اب بھی تم نہیں سمجھے فرقِ شمع و پروانہ
تم نے چھب جلائی ہے ہم نے دل جلائے ہیں

برقرار ہیں کیسے اعتماد دونوں کے
ہم لُٹے لٹائے ہیں وہ سجے سجائے ہیں

مُحتسب عدمؔ مجھ سے اس بنا پہ برہم ہیں
میں نے میگساروں کے حوصلے بڑھائے ہیں

وقت ہے حسین ساقی رخت ہے جواں ساقی
جامِ ارغواں ساقی ، جامِ ارغواں ساقی

کاکاوں سے بارش ہو اس طرح ستاروں کی
جام میں اُتر آئے آج کہکشاں ساقی

آ رہے ہیں پیمانے جا رہے ہیں پیمانے
کیا رواں رواں ساقی، کیا کشاں کشاں ساقی

صبحِ حشر کا تجھ کو وسوسہ ہے کیوں اتنا
خیر سے ابھی پوری شب ہے درمیاں ساقی

آج تو ارادہ ہے مان لیں کہا اُس کا
آئی ہے سبو لے کر عمرِ جاوداں ساقی

داخلِ عدم کر دے اس حسین آفت کو
آ رہی ہے کس جانب مرگِ ناگہاں ساقی

○

ہم ترستے رہے رِند سارے
مہ وشوں نے کہاں دن گزارے

اب تو پینی پڑیں گی شرابیں
جام دینے لگے ہیں ستارے

بول پڑتے ہیں بے جاں صنم بھی
کوئی اخلاص سے تو پکارے

کون محوِ تماشا ہوا ہے
رقص کرنے لگے ہیں نظارے

ایسی نظریں پڑیں عاشقوں کی
جل گئے آنچلوں کے کنارے

زخم اپنے ہی کانٹوں نے بخشے
تیر اپنے ہی یاروں نے مارے

بیت جائے نہ پھولوں کا موسم
آبھی جا اب مربی ہمارے

رات ہنستے ہوئے نین والا
کون تھا جوگیوں کے دوارے

ہم کو اب بھی عدم رُوپ والے
روز ملتے ہیں دریا کنارے

○

وہ شبیں، وہ سبو، وہ فسانے
یاد کتنے حسیں تھے زمانے

ہنستی ہنستی طرب ریز آنکھیں
بہکے بہکے گلابی بہانے

یاد ہے کچھ اگر تو بتاؤ
کیا کہا تھا گلوں سے صبا نے

تم نے اپنی ہی بات کی آخر
تم مرا مشورہ تو نہ مانے

رات ہم جا ہی پہنچے وہاں تک
بج رہے تھے جہاں شادیانے

اب کناروں کی جانب نہ دیکھو
چھوڑ دی ناؤ اب ناخدا نے

شیخ صاحب کو صوفی نہ سمجھو
یہ تو ساتھی ہیں اپنے پرانے

آ گئی ہے غزالوں کی بستی
توڑ ڈالن گے مگر کون جانے

پاس آتے نہیں جوگیوں کے
اے عدم یہ ہرن ہیں سیانے

•

حیراں سی نگاہ ہے اکھڑی سی چال ہے
جو مہ جبیں ہے خوف زدہ سا غزال ہے
کتنے حسیں گماں ہیں حقیقت بنے ہوئے
کیا خوشنما فریبِ تمنا کا جال ہے

تھا ہر معاملے میں جسے مجھ سے اختلاف
اب ہر معاملے میں مرا ہمخیال ہے
زاہد کو بد مذاق نہ فرمایئے خیال
در پردہ وہ بھی اپنی طرح نو نہال ہے

کیوں پھر رہے ہیں شیخ جی نزدیک میکدہ
یہ تانک جھانک کیا ہے یہ کیا دیکھ بھال ہے
کہتے ہیں میکدے کی ہوا ہے سرور بخش
کیوں آئے غمِ حیات ترا کیا خیال ہے

تو گردشِ سبو کی طرح تیز چل سکے
اے گردشِ زمانہ تیری کیا مجال ہے
جی چاہتا ہے حُسنِ عقیدت سے چوم لوں
نوکِ لبِ نگار بھی نوکِ ہلال ہے

آ اے نگارِ وقت کہ تھم جائیں وہ گھڑی
دنیا اسیرِ سلسلۂ ماہ و سال ہے
پھولوں سے اختلاط کریں یا چلے چلیں
اے تازہ واردانِ چمن کیا خیال ہے

ہاں ہاں میں جانتا ہوں عدم بے خبر نہیں
اُن کو مری خوشی کا بہت ہی خیال ہے

یاروں کے ساتھ سیرِ خرابات کر چلے
نکلے تھے گھر سے وقتِ سحر رات کر چلے

اِک صبح انکھڑیوں کی بھی قربت ہوئی نصیب
اک رات زلف سے بھی ملاقات کر چلے

ہم بھی کھڑے تھے پاس ہی معمول کیخلاف
جاتے ہوئے وہ ہم سے بھی بات کر چلے

اس باب میں بھی دل کو بھرم تھے بڑے غلط
اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات کر چلے

اب آپ سوچتے رہیں جتنا بھی جی کرے
ہم تو حضور آپ سے سب بات کر چلے

کچھ ہم پہ دوستوں نے بھی احساں کیا عدمؔ
کچھ ہم بھی دوستوں پہ عنایات کر چلے

•

ہوش کی تلخی دُور کرو
توبہ کو اب چور کرو

جبر کی اِک حد ہوتی ہے
اتنا مت مجبور کرو

لطف نہیں تو جور سہی!
کچھ حسبِ دستور کرو

دل مت توڑو، ٹھیک نہیں
نذرانہ منظور کرو

اچھے بھلے لگتے ہو عدمؔ
وہم کو دل سے دُور کرو

شعلہ ہے گلدان نہیں
جل جانا آسان نہیں

اب دل میں وہ رہتے ہیں
اب بستی ویران نہیں

دریا کو کیا پار کریں
دریا میں طوفان نہیں

تصویریں ہیں کیا دلکش
تصویروں میں جان نہیں

درد کا کیا درمان عدمؔ
درد کا کچھ درمان نہیں

○

شب کے گماں یقینِ سحر تک پہنچ گئے
ہم اتحادِ شمس و قمر تک پہنچ گئے

تھے ابتدائے علم و خبر کے بھی جو خلاف
وہ انتہائے علم و خبر تک پہنچ گئے

دیوانگی تھی اور کہاں جا کے پھینکتی
پا پایانِ کار آپ کے در تک پہنچ گئے

کیا آگ تھی جو جملۂ جاں تک بکھر گئی
کیا زخم تھے جو قلب و جگر تک پہنچ گئے

پہچان ہی لیا اُسے لاکھوں کے درمیان
ہم اپنے انتخابِ نظر تک پہنچ گئے

زلفیں کمر کے پار نظر سے ماورا
اہلِ ہنر کمالِ ہنر تک پہنچ گئے

اے رہنما ابھی سفینوں کے چلنے کی دیر ہے
ساحل سے چل پڑے تو بھنور تک پہنچ گئے

ہستی سے تا عدم ہے بھلا فاصلہ ہی کیا
چل کر اِدھر سے لوگ اُدھر تک پہنچ گئے

•

اس جنبشِ مژہ کا گلستاں ہے رقص میں
یا کوئی نوجواں غزلخواں ہے رقص میں

تجھ کو بگولے پہ ہے رقص کا گماں
اے بے خبر تمام بیاباں ہے رقص میں

پھر آرزو کی آگ لگی ہے حواس کو
پھر زندگی کا خوابِ پریشاں ہے رقص میں

ثابت ہوا کہ موسمِ گل کچھ قریب ہے
محسوس ہو رہا ہے گریباں ہے رقص میں

ویسے تو ہم نہیں کرتے یہ التجا
آجا کہ آج ابرِ خراماں ہے رقص میں

آتا ہے بے دریغ زلیخا پہ یُوں شباب
دیوانہ وار یوسفِ کنعاں ہے رقص میں

اِس مرتبہ بہار پہ آتی نہیں خزاں
غنچے نہیں تو چشمِ غزالاں ہے رقص میں

زلفوں کے ساتھ شعلۂ خوشبو ہے مشتعل
شیشے کے ساتھ گردشِ دوراں ہے رقص میں

کس دلکشی سے شاخِ نشیمن ہے نغمہ زن
کس تمکنت سے برقِ فروزاں ہے رقص میں

گاتی ہوئی یونہی چلی جاتی ہے زندگی
کشتی ہے رقص میں کبھی طوفاں ہے رقص میں

بیٹھے ہیں رندِ دائرہ باندھے ہوئے عدمؔ
کس اہتمام سے غمِ دوراں ہے رقص میں

کنول کی جوت، پیمانے کا غم ہے — مرا طرزِ تغافل بھی صنم ہے

گری ہے برق تو میرے مکاں پر — تجھے کس بات کا اے دوست غم ہے

بغیر اس کے بھی بن جاتی ہے جاں پر — ستم بھی ایک اندازِ کرم ہے

ذرا محتاط رہیئے رنگِ گل سے — غزالانِ چمن کو خوفِ رم ہے

تمام آلامِ ہستی مٹ گئے ہیں — تری مخمور آنکھوں کی قسم ہے

نظر آتا ہوں میں اس واسطے خوش — مجھے اندیشۂ انجام کم ہے

کدھر جائیں گے چھپ کر جینے والے
پسِ غمخانۂ ہستی، عدم ہے

شکستِ سازِ عرضِ مدعا ہے
شکستہ ساز میں بھی اک صدا ہے

جوانی منزلیں طے کر رہی ہے
محبت کا بگولا رہنما ہے

خدا ایمان کو محفوظ رکھے
جو دلبر ہے وہ کافر ماجرا ہے

لکھا ہے خط یہ کس رشکِ چمن نے
تمام الفاظ میں رنگِ حنا ہے

نہیں ہے تو نہ ہو میری بلا سے
مجھے محسوس ہوتا ہے خدا ہے

عجب حالت ہے ناہنجار دل کی
گماں ہوتا ہے جیسے مر گیا ہے

ترے چہرے پہ شادابی ہے مے کی
تری آنکھوں میں تاروں کی ضیا ہے

فراوانی مری دانائیوں کی
مری دیوانگی کی ابتدا ہے

گریباں چاک کر ڈالو گلوں کے
صبا کو بد مذاقی کا گلا ہے

تمھاری بات ہے کیا جھوٹ ہو گی
جو فرما دیجئے صاحب بجا ہے

چلو شاید بسیرا ہو کسی کا
افق کے پاس روشن اک دیا ہے

قدم اُٹھتے ہی منزل آ گئی ہے
خلوصِ گمرہی کی انتہا ہے

تماشا پوچھتا ہے آگہی سے
شہود و شاہد و مشہود کیا ہے

عدم کیوں مر نہ جائیں مسکرا کر
سُنا ہے وہ حسیں ہم سے خفا ہے

○

جہاں جاتا ہوں افتادِ طبیعت ساتھ ہوتی ہے
صداقت ساتھ ہوتی ہے، محبت ساتھ ہوتی ہے

سفر تنہا نہیں کرتے کبھی جو اہلِ دانش ہیں
نہ ہو کوئی تو رستے کی صعوبت ساتھ ہوتی ہے

قیامت شوخیٔ رفتار ہی کا اک نمونہ ہے
وہ جب لہرا کے چلتے ہیں، قیامت ساتھ ہوتی ہے

میں پڑھ لیتا ہوں تحریریں مشیّت کے ارادوں کی
جہاں نازک سا ایما ہو، عبارت ساتھ ہوتی ہے

وہ جب بھی دیکھتے ہیں ہم کو پُرمعنی نگاہوں سے
بڑی تفصیل سے پوری حکایت ساتھ ہوتی ہے

مدد لینی ہی پڑتی ہے عدم توفیق والوں سے
ضرورت مند ہیں اکثر ضرورت ساتھ ہوتی ہے

•

تکلّم ہی نہیں صورت کشِ افکار ہوتا ہے
خموشی سے بھی کچھ، مفہوم کا اظہار ہوتا ہے

وہ نازک خال و خد والا، وہ بانکے ابروؤں والا
کبھی لہرا کے چلتا ہے تو بس تلوار ہوتا ہے

تعلّق ہے وہ جس انداز کا جس سے بھی ہو جائے
نہ کوئی غیر ہوتا ہے، نہ کوئی یار ہوتا ہے

محبّت ایک کیفیت ہے تیری مست آنکھوں کی
محبّت کرنے والا قدرتاً میخوار ہوتا ہے

وہ یوں انگڑائی لیکر جاگتے ہیں خوابِ شیریں سے
کہ جیسے بتکدے کا زمزمہ بیدار ہوتا ہے

محبّت کرنے والوں سے بہت مایوس ہے علیسے
جو ہوتا ہے بڑے اخلاص سے بیمار ہوتا ہے

مرا اسلوب ایسے بھی ذرا آساں نہیں یعنی
مرا انداز ویسے بھی ذرا دشوار ہوتا ہے

خرد قائم نہیں رہتی کسی معمول و مسلک پر
جنوں جو سوچ لے وہ نقش بر دیوار ہوتا ہے

عدم پہلے تو خالی نظریئے بنتے بگڑتے ہیں
مرتب بعد میں جا کر کوئی معیار ہوتا ہے

○

تجھے کیا پتہ ہے تجھے کیا خبر ہے ‌ ‌ تری گفتگو کس قدر با اثر ہے

یہ کیا سُن رہا ہوں میں اہلِ نظر سے ‌ ‌ یقینِ نظر بھی فریبِ نظر ہے

چلو ایک مشکل تو آساں ہوئی ہے ‌ ‌ سُنا ہے کہ رستہ بڑا پُر خطر ہے

یہ کانٹا جو مالی سے تجھے چبھ گیا ہے ‌ ‌ یہ کانٹا بھی گلشن کا لختِ جگر ہے

جہاں ختم کر دے اُسے کہنے والا ‌ ‌ کہانی ہماری وہیں مختصر ہے

مشیت ابد تک مرا ساتھ دے گی ‌ ‌ زمانہ ازل سے مرا ہم سفر ہے

پیالہ عدم آنکھ ہے میکدے کی
صراحی جواں آہوؤں کی نظر ہے

○

ہمیں یہ نہیں علم کیا ہو گیا ہے
طبیعت کو کیا برملا ہو گیا ہے

بلا سے سفینہ اگر ڈوب جائے
تو ناکس کیوں ناخدا ہو گیا ہے

مجھے راہ میں کام تھا اک ضروری
بڑا ظلم اے رہنما ہو گیا ہے

قفس تک پیایات کیوں جا رہے ہیں؟
چمن میں کوئی حادثہ ہو گیا ہے

جسے آدمیت نہیں راس آئی
وہی ابنِ آدم خدا ہو گیا ہے

ہوئی ہے یہ تازہ بلا ہم پہ نازل
وہ بیدادگر، باوفا ہو گیا ہے

کسے باغباں ڈھونڈتا ہے قفس میں
وہ طائر تو کب کا رہا ہو گیا ہے

نئے ہاتھ اِس دلکشی سے لگے ہیں
پرانا سبو بھی نیا ہو گیا ہے

نگاہوں سے یوں بات کی ہے کسی نے
عدمؔ بات کا حق ادا ہو گیا ہے

وہ گلستاں میں جو ناوک بکف چلے آئے
ہر ایک سمت سے صید و ہدف چلے آئے

اٹھی نگاہ جدھر عالم جوانی میں !!
سمن بروں کے پرے صف بہ صف چلے آئے

سوائے پریوں کے کچھ بھی نظر نہیں آتا
ہجوم کیف میں ہم کس طرف چلے آئے

گئے تھے مانگنے دل خالق جواہر سے
اٹھا کے ایک زبوں سا صدف چلے آئے

اُداس بیٹھے تھے کس وقت سے عدم مطرب
کہاں سے لیکے ابھی ساز و دف چلے آئے

بہ قدرِ حوصلہ جمالِ بتاں کی بات چلے
یہاں کی بات چلے تو وہاں کی بات چلے

چھڑا ہے ذکر کچھ ایسے دراز زلفوں کا
کہ جیسے سلسلۂ کہکشاں کی بات چلے

چلے ضرور کوئی بات چھیڑ کی خاطر
یقیں کی بات نہیں تو گماں کی بات چلے

اگرچہ عہدِ بہاراں بہت قریب نہیں
مگر سوال یہ ہے کیوں خزاں کی بات چلے

ہم اپنی کرتے ہیں اور شیخ اپنی کرتا ہے
کسی طرف سے کوئی درمیاں کی بات چلے

مجھے یہ ڈر ہے قفس پر نہ آ گرے بجلی
قفس کے بیچ اگر آشیاں کی بات چلے

سنا ہے میں نے وفا کا کوئی وجود نہیں
یہ ٹھیک ہے تو کسی داستاں کی بات چلے

ہے اعتراض تو کیا اعتراض ہے تم کو
اگر تمہارے لبِ ارغواں کی بات چلے

چھڑا ہے ذکر حسینوں کے نوکِ ابرو کا
اب کس کیا تہ عدم کیا کماں کی بات چلے

•

جوانی، خوشی، بانکپن سینچتے ہیں
بہاروں کے دن اپنا فن سینچتے ہیں

ہمیں کوئی غربت کی اک شام دے دے
تو ہم لوگ صبحِ وطن سینچتے ہیں

گل و غنچہ کے پاس رکھا ہی کیا ہے
چرائے ہوئے پیرہن سینچتے ہیں

حکایاتِ مشک و صبا کہنے والے
ولایاتِ سرو و سمن سینچتے ہیں

عدم تم کو جس کی ہے اتنی ضرورت
وہ تنویرِ تبسم تن سینچتے ہیں

کیا دلنشیں اسلوب ہیں!
وہ ہر قبا میں خوب ہیں

یہ غنچہ و گل باغباں!
کس شوخ کے مکتوب ہیں

وہ تیکھے بھی ہوں اے ناصحا
مجھ کو بہت مرغوب ہیں

ہم کو بتا تو دیجئے
ہم کس لئے معتوب ہیں

ہے ساخت ہر شے کی جدا
ہم زشت ہیں وہ خوب ہیں

وہ ٹھیک کہتے ہیں عتیقؔ
ہم واقعی مجذوب ہیں

مرے بغیر نہ بزمِ طرب سجا دینا
جب آئے فصلِ بہاراں مجھے صدا دینا

تو اپنی آنکھ کی نیت کو دیکھ لے خود ہی
مجھے نہ بعد میں ساقی کوئی گلا دینا

جہاں جہاں تجھے تنہائی نے اداس کیا
وہاں وہاں مجھے دھیمی سی اک صدا دینا

مرے خلوص کو احساس بھی نہ ہو اس کا
کچھ اس طرح مرے اخلاص کو سزا دینا

مرا بگاڑ ہو سانچہ نئی عمارت کا
بگاڑ کر مجھے اتنا حسیں بنا دینا

ہم ان کے دل میں اگر کچھ جگہ عدم رکھتے
تو اتنا سہل نہ ہوتا ہمیں بھلا دینا

سکونِ صبح نہیں، اضطرابِ شام نہیں
حیات و موت کا وہ حسنِ انتظام نہیں

ہجومِ یاس میں یوں لے رہا ہوں حیرت سے
تمہارا نام کہ جیسے تمہارا نام نہیں

اب اور جسم کو کر لیگی اسیر کیا دنیا
کہ زندگی سے بڑا اور کوئی دام نہیں

میں سوچتا ہوں شرابِ طہور کی بابت
یہاں حرام ہے لیکن وہاں حرام نہیں

مجھے تمہارے ستم ہی بہت غنیمت ہیں
مجھے تمہاری مروت سے کوئی کام نہیں

صداقتوں کا نمونہ بھی کوئی پیش کرو
روایتوں کا مجھے کوئی احترام نہیں

عدمؔ محبتِ فرہاد اگر حقیقی تھی
ہمارا حسنِ عقیدت بھی اتنا خام نہیں

ماتمِ دستِ نارسا نہ ہوا
ہاتھ شرمندۂ دعا نہ ہوا

اُنکے احساں تو بے نہایت تھے
اتفاقاً مرا بھلا نہ ہوا

مصلحت کے تمام رشتے تھے!
گوشت ناخن سے کب جُدا نہ ہوا

جس جگہ سے ہوا خود کا گزر
اُس جگہ سایۂ ہُما نہ ہوا

ہائے وہ بانصیب خطۂ گل
جو ترا سایۂ قبا نہ ہوا

کچھ نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے
اک فرشتہ ہوا خدا نہ ہوا

انکی نیت تو ٹھیک تھی بالکل
کیا ہوا قول اگر وفا نہ ہوا

مدعا خود ہی مر گیا ہنس کر
شکر ہے خونِ مدعا نہ ہوا

بات ادھوری ہی رہ گئی آخر　　بات کا کوئی فیصلہ نہ ہوا
میں نے چھیڑا تھا مصلحت سے اُسے　　وہ بھی کچھ سوچکر خفا نہ ہوا
گو ہوا سخت ناموافق تھی　　ناخدا بندۂ خدا نہ ہوا
جوئے شیر ایک مرتبہ نکلی　　پھر کوئی محرمِ وفا نہ ہوا
وہ تو غارتگری پہ مائل تھے　　میں تکلف میں مبتلا نہ ہوا
گو غلط تو نہیں ہے یہ بھی!　　ہم سمجھتے ہیں کچھ بجا نہ ہوا

پھوٹ نکلا عدم چناروں سے
جل گیا دل مگر فنا نہ ہوا

○

غم کریں کیوں گئی بہاروں کا
شہر نزدیک ہے نگاروں کا

عنبریں کاکلوں کی بستی میں
ختم ہوگا سفر ستاروں کا

سانس لیں ہم کہ ہنس کے مر جائیں
کیا ارادہ ہے غمگساروں کا

اے خزاں تو پلٹ ہی جا ورنہ
عزم کچھ اور ہے بہاروں کا

منزلیں گر گئیں نگاہوں سے
دیکھ کر حسن رہگزاروں کا

آپ ہوں، ہم ہوں، جام و صہبا ہوں
اور جنگل ہو اک چناروں کا

غنچہ و گل کے پیرہن ہیں عدمؔ
رنگ ہے آنکھ کے اشاروں کا

○

میرے محبوب تو اس وقت کہاں جاتا ہے
شام کے بعد گزرگاہ سے خوف آتا ہے

آنے والے تری تشویش نئی چیز نہیں
نو گرفتارِ قفس میں یونہی گھبراتا ہے

یاد آتی ہے تری اس طرح اجڑے دل میں
جیسے ساون میں کوئی جام کھنک جاتا ہے

یہ تردد بھی مناسب ہے کسی سے پوچھو؟
یہ تکلف بھی مری جاں کوئی فرماتا ہے؟

دوپہر ہے کسی مقتل کی کہ میری ہستی
میرا سایہ بھی مری ذات سے کتراتا ہے

میکدے میں تری آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میکدہ تیری نگاہوں کی قسم کھاتا ہے

صورتِ حال کچھ اس درجہ ہے دلچسپ عدم
صورتِ حال پہ رونا سا مجھے آتا ہے

لذتِ وعدۂ دیدار نئی چیز نہیں
چیز عمدہ ہے مگر یار نئی چیز نہیں

بیوقوفو! رسن و دار تو ہے مذہبِ عشق
بیوقوفو! رسن و دار نئی چیز نہیں

قیس و فرہاد بھی بیٹھے تھے یہیں آ کر
آپ کا سایۂ دیوار نئی چیز نہیں

چیز بالکل ہے نئی آپ کا اسلوبِ ستم
کون کہتا ہے کہ سرکار نئی چیز نہیں

میں سمجھتا ہوں یہ ماحول ہے تازہ پھر
وہ سمجھتے ہیں یہ دیوار نئی چیز نہیں

چاندنی کس لئے انگشت بدنداں ہے عدمؔ
تابشِ کاکلِ خمدار نئی چیز نہیں

نوا نہیں ہے، جادہ ہے — یہ کون ہمکلام ہے
لبوں کا قفل توڑیئے — صنم کدے کی شام ہے
یہ کیا علیل سی روش — یہ کیا انصرام ہے
نہ ابروؤں میں تیر ہیں — نہ گیسوؤں میں دام ہے
نگاہ تو اٹھائیے — یہ ساز ہے، وہ بام ہے
یہ کیسی سوچ اور جھجک — نہ روک ہے، نہ تھام ہے
رباب ہاتھ ہاتھ ہے — شراب جام جام ہے
کہاں ہیں ہم میرے صنم — یہ کون سا مقام ہے

نہ ہے ملال کا گزر — نہ ظلمتوں کا نام ہے
جنوں ہے چاند کی طرح — خرد ستارہ فام ہے
نہال گلعذروش ہے — غزال خوش خرام ہے
بہار رنگ ورُود میں — نگار کا پیام ہے
صبا ہمہ نیاز ہے — سبو ہمہ سلام ہے
کہیں ازل کی صبح ہے — کہیں ابد کی شام ہے

وجود ہے صدف نشیں
عدم فلک مقام ہے

سبو کو توڑ ندامت گو "تہی" ہو — کسی کی جان نہ اس میں رہ گئی ہو
چلو سیرِ قیامت کر ہی آئیں — وہاں دنیا کوئی شاید نئی ہو
اجل کیا بد دعا دے کر گئی ہے — اگر وہ بد دعا لگ ہی گئی ہو
خرابِ زندگی ہونے کی لت ہے — تو اچھا جا، خرابِ زندگی ہو
پرانے شعبدوں کو چھوڑیئے اب — کوئی تازہ فریبِ آگہی ہو
جو کرنا ہے تکلّف سے نہ کیجے — بلا سے دوستی یا دشمنی ہو
کوئی دلکش سا وعدہ اور کیجے — مگر اتنی نہ اس میں دلکشی ہو
نہیں اتنے بکھیڑوں کی ضرورت — کوئی سادہ سی سچّی سی خوشی ہو

عدمؔ کیوں دے رہے ہو ہم کو دھوکا
اگر باغوں میں اب بھی چاندنی ہو

○

وہ رُوح جس کا محبت اصول ہو جائے
چٹک کے غنچے کی مانند پھول ہو جائے

میسّر آئے ذرا سا جنوں کا سرمایہ
خرد کی تھوڑی سی قیمت وصول ہو جائے

خوشی کا رنگِ تبسّم ہے پھیکا پھیکا سا
خدا کرے کہ طبیعت ملول ہو جائے

دُعا تو مانگی ہے رسؔا مگر خدا کی قسم
مجھے امید نہیں ہے قبول ہو جائے

خزاں رسیدہ سا غنچہ ہے دل ہنوز عدم
چلے ہوائے بہاراں تو پھول ہو جائے

○

سحر کا وقت بھی کیا پُر سرور ہوتا ہے
عجیب تازگی ہوتی ہے، نور ہوتا ہے

خیالِ یار نہیں تو خلوصِ راہ سہی
کوئی شریکِ سفر تو ضرور ہوتا ہے

نکل بھی جا کسی جانب تلاش میں اس کی
بہ نظرِ لطیف وہ نزدیک و دُور ہوتا ہے

فراقِ شبنم و گل کوئی تازہ ظلم نہیں
یہ حادثہ تو ازل سے حضور ہوتا ہے

لگے ہیں ایسے خیالوں کو حرص کے خوشے
کہ جیسے آم کی شاخوں پہ بُور ہوتا ہے

ہوا ہے یہ کہ اندھیروں نے ڈس لیا ہے انہیں
سُنا یہ تھا کہ ستاروں میں نور ہوتا ہے

ذرا سی پی کے کرو رُخ دہاں کا اے موسےٰ
سُنا ہے طور پہ طوفانِ نور ہوتا ہے

علامؔ اُس آنکھ کو دیکھو تو یہ کھُلے تم پر
شباب کس طرح نشّے سے چور ہوتا ہے

•

حسینوں کی بڑی تعریف کی ہے
بتوں کی داستاں تصنیف کی ہے

گل و غنچہ پریشاں ہو رہے تھے
صبا نے آ کے کچھ تالیف کی ہے

یہ قبرستان یہ شب کا اندھیرا
حضور اس وقت کیوں تکلیف کی ہے

جنوں تو کہہ ہی دیتا بات ساری
خرد نے سوچ کر تحریف کی ہے

ستارے مضطرب ہیں، چاند ساکت
یہی صورت مری تکلیف کی ہے

عدم غربت میں یاد آ کر وطن نے
صعوبت میں بڑی تخفیف کی ہے

تو کس قدر گلفام ہے
اک صبح دل آرام ہے

یہ جام بھی لے لیجئے
یہ بھی تمھارا جام ہے

آغاز اچھا ہو اگر
آئینۂ انجام ہے

تکلیف کیا ہو گی ہمیں
آرام ہی آرام ہے

کیا بات ہے اُن کی عدمؔ
جو بات ہے الہام ہے

مہ جبینوں کے وہی کام ابھی باقی ہیں
عُذر باقی ہیں ابھی، دام ابھی باقی ہیں

اِک خدا ایک تری ذات نہیں بھول سکی
ذہن میں ایک دو اصنام ابھی باقی ہیں

کچھ مہکتی ہوئی شامیں ہیں خراماں اب تک
کچھ کھنکتے ہوئے ایام ابھی باقی ہیں

ناچشیدہ ہیں ابھی اور قواعد باقی
اور نادیدہ در و بام ابھی باقی ہیں

سر و مہتاب سے اجسام کا شکوہ مت کر
گرم تا نبے کے کچھ اندام ابھی باقی ہیں

سر جھکا کر ذرا سُن لے انہیں اے موسم گل
میگساروں کے کچھ احکام ابھی باقی ہیں

چند قصّوں کے نتیجے تو ہوئے شکل پذیر
چند افسانوں کے انجام ابھی باقی ہیں

تیری بیداد اگر ختم ہوئی تو پھر کیا
جانِ من سینکڑوں آلام ابھی باقی ہیں

ایسے مصروف نظر آتے ہیں سب لوگ یہاں
کوئی سمجھے کہ بہت کام ابھی باقی ہیں

روز گھڑتی ہے مشیّت نئے آلات نوا
دفترِ غیب کے پیغام ابھی باقی ہیں

چند تعبیر شدہ خواب ہیں محفوظ ابھی
چند تخلیق شدہ جام ابھی باقی ہیں

تیری فہرست تو یارب بڑی چھوٹی نکلی
میری فہرست میں کچھ نام ابھی باقی ہیں

میں نہیں جنّتِ موہوم کا محتاج عدمؔ
میرے شیشے، میرے اصنام ابھی باقی ہیں

بے تکلف سحر و شام چلے آتے ہیں
آنے والے تو بہر گام چلے آتے ہیں

آخری آس بھی نکلی ہے سراسر باطل
مسکراتے ہوئے ناکام چلے آتے ہیں

صرف اک جام چلا آئے تو پھر بعد ازاں
سلسلہ وار کئی جام چلے آتے ہیں

حسبِ دستور طبیعت ہے شگفتہ ساقی
حسبِ معمول سبک گام چلے آتے ہیں

شیخ تو حجرۂ مسجد میں توقف فرما
کر کے ہم چھوٹا سا اک کام چلے آتے ہیں

بربط و شیشہ و قندیل کے پیرایے میں
کتنے بہتے ہوئے ایام چلے آتے ہیں

دم بہ دم کتنے خمِ زلف ہیں آغوش کشا
پے بہ پے کتنے حسیں دام چلے آتے ہیں

اُن کے پیغام کہاں ہوتے ہیں مسدود و عدم
اُن کے پیغام مرے نام چلے آتے ہیں

●

اُٹھایا جب اکیلے جام ہم نے
بڑی آہیں بھریں کل شام ہم نے

بہت خوش خلق اور خندہ جبیں تھا
نہ پوچھا ہمسفر کا نام ہم نے

اِدھر آؤ ذرا اے مہ جبینو!
بچھایا ہے وفا کا دام ہم نے

حقیقی عشق میں کچھ بھی نہیں تھا
محبّت کی برائے نام ہم نے

طلوعِ حشر نے آواز دے دی
کیا تھا دو گھڑی آرام ہم نے

عدمؔ کتنی عقیدتمندیوں سے
کیا اُس شوخ کو بدنام ہم نے

پری وش حبیب درِ میخانہ کھولیں
مرے ظرفِ طلب کو کم نہ تولیں

مری سرکار نازک ہے زمانہ
کسی مےخوار سے ہنس کر نہ بولیں

ستارے باغ میں اُترے ہوئے ہیں
چلو صہبا پئیں اور پھول رولیں

ستارے دائرہ باندھے کھڑے ہیں
مری سرکار اب زلفوں کو کھولیں

عدم ان کاکلوں کی نکہتوں میں
طبیعت چاہتی ہے خُوب سولیں

•

دیارِ دل میں نگارِ حسیں نہیں کوئی
مکاں تو خوب ہے لیکن مکیں نہیں کوئی

تمھاری بات تو دلچسپ ہے بڑی لیکن
تمھاری بات پہ مجھ کو یقیں نہیں کوئی

مرا خیال تھا میں ہی یہاں اکیلا ہوں
سنا ہے آپ کا بھی ہم نشیں نہیں کوئی

خزاں کا پھول وہ نقشِ علیل ہے جس میں
خطِ شراب و رگِ انگبیں نہیں کوئی

خزاں میں بھی پلٹ آتی ہے فصلِ گل لیکن
چمن طراز وہ بہار آفریں نہیں کوئی

یہ سب کرشمہ ہے آنکھوں کی حُسن بینی کا
خود آپ اپنی جگہ دل نشیں نہیں کوئی

غزال پھرتے ہیں کیا بے کھٹک چمن میں علمؔ
انہیں گماں ہے یہاں در کمیں نہیں کوئی

○

جو لوگ راہِ طلب میں خراب ہوتے ہیں
وہی مرادِ دو کامیاب ہوتے ہیں

میں دوستوں کی عنایات کا نہیں شاکی
کہ دوستوں کے دلوں میں حساب ہوتے ہیں

بتوں کو دیکھ کے میں ہوش میں نہیں رہتا
جواں نقوش بھی موجِ شراب ہوتے ہیں

جواب اگرچہ مرے بھی نہیں ہیں کم دلکش
سوال اُن کے بڑے لاجواب ہوتے ہیں

نہ پوچھ کس طرح شبنم کے گرم بوسوں سے
گلوں کے نرم کلیجے کباب ہوتے ہیں

بڑے مقام ہیں آہنگ کے ترشح کے
سبو بھی موسمِ گل میں رباب ہوتے ہیں

فقیہہ زاہد و صوفی وہ خاص بندے ہیں
عدمؔ گناہ بھی جن کے ثواب ہوتے ہیں

ہم آپ سے جب عشق کا اظہار کرینگے
ہر خوف کو نذرِ رسن و دار کرینگے

ہو جائے کسی طور جدا گوشت سے ناخن
کچھ لوگ یہ تکلیف بھی سرکار کرینگے

غفلت نہ کرے گی یہ کرشمات کی دُنیا
جو غیر نہ کر پائیں گے، وہ یار کرینگے

ہم کیا ہیں! بضاعت ہی بھلا کیا ہے ہماری!
بجز صدقۂ جاں کون سا ایثار کرینگے

سرکار مرے چاک گریبان پہ نہ ہنسنا
سرکار تماشا گل و گلزار کرینگے

موسیٰ ہی پہ موقوف نہیں ضبطِ تقاضا
ہم لوگ بھی کچھ آپ سے تکرار کرینگے

اِتنا نہ ڈرو ہم سے بیابانوں کے غزالو
ہم اہلِ چمن تم کو بڑا پیار کرینگے

یہ محتسبِ وقت بھی ہے چیز بلا کی
آج اس سے بھی جھگڑا سرِ بازار کرینگے

ہم آپ کو ہونے نہ کبھی دینگے شرابی
ہم آپ کو ہر وقت خبردار کرینگے

شادابیٔ افکارِ عدم کارِ مغاں ہے
یہ کام یہی ہوش کے معمار کرینگے

•

اے ماہِ محرم! صورتِ حالات وہی ہے
وحشت ہے وہی شوقِ ملاقات وہی ہے

بدلا ہے کس انداز سے مفہوم کو اُس نے
گو بات کی وہ شکل نہیں، بات وہی ہے

یہ شب بھی اُسی رات کی مانند ہے روشن
محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ رات وہی ہے

فرہاد نہ جانا کبھی شیریں کے نگر میں
کمبخت وہاں قیمتِ اوقات وہی ہے

آئندہ بدل جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتے
اب تک تو علامِ صورتِ حالات وہی ہے

جواب بات کا جو برملا نہیں دیتے
وہ بعد ازاں بھی کوئی حوصلا نہیں دیتے

لباسِ غنچۂ گل میں بھی عشق زخمی ہے
گناہِ شوق کی اتنی سزا نہیں دیتے

پتا ترا کوئی ہم سے ہی آ کے کیوں پوچھے
غلط ہی کیا ہے اگر ہم پتا نہیں دیتے

بغیر مے کے بہاریں اداس رہتی ہیں
بغیر آپ کے موسم مزا نہیں دیتے

کبھی کبھی کہیں ملنا بہت ضروری ہے
تعلقات کو بالکل بھلا نہیں دیتے

وہ بد دعا سے بھی اب تنگ آ گئے ہیں عدمؔ
وہ کچھ دلوں سے ہمیں بد دعا نہیں دیتے

کسی جوان بھرم کی بڑی ضرورت ہے
تری نگاہِ کرم کی بڑی ضرورت ہے

ہے منہمک تو کسی مشغلے میں خلقِ خدا
فریبِ دیر و حرم کی بڑی ضرورت ہے

جنوں نہیں جو بناتا ہے راستہ اپنا
خرد کو نقشِ قدم کی بڑی ضرورت ہے

ستم ظریف تجھے کیا خبر کہ لوگوں کو
ترے حسین ستم کی بڑی ضرورت ہے

تجھے طلب ہے رہِ راست کی تو ہو عدم

مجھے تو خندقِ زخم کی بڑی ضرورت ہے

الم نہ ہو تو خوشی اک وبال ہو جائے

خوشی کے ساتھ الم کی بڑی ضرورت ہے

کہیں سے پیدا کرو اُس جوان کو یارو!

وہ کہہ رہے ہیں عدم کی بڑی ضرورت ہے

O

مجھ کو احوالِ گلستاں پہ ہنسی آتی ہے!
اس حسیں خوابِ پریشاں پہ ہنسی آتی ہے

مہ جبینوں سے یہ دریافت تو کیجے اُن کو!
کیوں مرے چاک گریباں پہ ہنسی آتی ہے

ہے بھرم اس کا بھی قائم تری انگڑائی تک
وسعتِ عالمِ امکاں پہ ہنسی آتی ہے

آ تو جاتا ہے مگر ہنس کے چلا جاتا ہے
مجھ کو اکثر غمِ دوراں پہ ہنسی آتی ہے

آج پھر اُس کا بُرا حال ہے میرے باعث
آج پھر صورتِ ویراں پہ ہنسی آتی ہے

پار لگنے کا کچھ امکان ابھی ہے یارو!
ناخدا کو ابھی طوفاں پہ ہنسی آتی ہے

عقل کے وہم پہ یُوں آتا ہے خندہ جیسے
وحشتِ چشمِ غزالاں پہ ہنسی آتی ہے

آپ کا قول بھی سرکار تکلّف تو نہیں
کیوں مجھے آپ کے پیماں پہ ہنسی آتی ہے

تتلیاں پھولوں کے جھرمٹ میں جو کرتی ہیں خرام
باغ کو تختِ سلیماں پہ ہنسی آتی ہے

زندگی پر مجھے یوں آتا ہے خندہ جیسے
اِک بگولے کو بیاباں پہ ہنسی آتی ہے

ہم وہ دیوانے ہیں جب ہنسنے پہ آ جاتے ہیں
ہم کو ہر صورتِ گریاں پہ ہنسی آتی ہے

کیا تماشا سا بنا ڈالا ہے ظالم نے عدمؔ
بعض اوقات تو یزداں پہ ہنسی آتی ہے

○

•

مَیں بھی کونین کا اک رنگ ہُوا جاتا ہوں
آسمانوں سے ہم آہنگ ہُوا جاتا ہوں

مُسکرا دو کہ طبیعت ہو کشادہ میری
کثرتِ فکر سے دل تنگ ہُوا جاتا ہوں

کتنا پیچیدہ و سادہ ہے وہ حُسنِ دلکش
جس قدر دیکھتا ہوں دنگ ہُوا جاتا ہوں

رُوحِ کونین ہی نغمہ نہیں بنتی جاتی
میں بھی آلودہ آہنگ ہُوا جاتا ہوں

ہے علامِ کوئی تو توقیر بچا لے اُس کی
منکرِ صنعت ارژنگ ہُوا جاتا ہوں

میرے خلوص، تیری رضا کے قریب ہیں
اہلِ نیاز، شہرِ صبا کے قریب ہیں

مجھ کو تو ڈر سا آپ سے لگتا ہے شیخ جی
میں نے سُنا ہے آپ خدا کے قریب ہیں

اے کاش ٹوٹ جائیں کسی اتفاق سے
وہ ہاتھ جو حدودِ دُعا کے قریب ہیں

اب اپنی گمرہی سے بھی شاید نہ مل سکیں
وہ راہرو جو راہ نما کے قریب ہیں

اب صبح ڈھونڈتی پھرے ہم کو تمام عمر
اب ہم سوادِ شامِ بلا کے قریب ہیں

اب آگہی فریب نہ دے گی قیاس کو
اب ہم مقامِ صبر و رضا کے قریب ہیں

مشکل نہیں پہنچنا عدمؔ اب بہشت تک!
اب ہاتھ اُس حسیں کی قبا کے قریب ہیں

•

وہ روشنی، وہ رنگ، وہ حدّت، وہ آب لا
ساقی طلوع ہوتا ہُوا آفتاب لا

آ! وحشتِ خرد کو ذرا سا سکون دے
جا! مکتبِ شباب کی پہلی کتاب لا

ہلکی سی بے حسی بھی بہاروں کی موت ہے
تھوڑی سی دیر بھی نہیں واجب، شراب لا

پھُولوں کی خواہشوں میں تو کیا لہرائے گی
کلیوں کی نیّتوں میں ذرا انقلاب لا

ساقی کوئی بھڑکتی ہوئی سی شراب دے
مُطرب کوئی تڑپتا ہُوا سا رباب لا

جامِ عدم بھی دَور میں آ جائے گا ابھی
تو اپنی چاندنی تو شبِ ماہتاب لا

پھر آج ذہن میں چُبھتا ہوا ہلال آیا
کسی کے ابروئے خم دار کا خیال آیا

کوئے صنم سے جب آئے ہمیں نہیں ملتی
یہ کون کان میں کچھ بوئے گل کے ڈال آیا

سبو اُٹھاؤ کہ بادِ صبا کا اِک جھونکا
خزاں کو آج اُفق سے پرے نکال آیا

خزاں کی صبح تو کر غور اس پہ اے مالی!
شبِ بہار پہ بے وقت کیوں زوال آیا

گیا تھا عشق مجھے لے کے ان کی محفل میں
خود آگیا مجھے اک حادثے میں ڈھال آیا

عدم عجیب شعار ہے مے فروشوں کا
وہاں جو آیا بہ سرمستیٔ کمال آیا

•

مرے خلوص کا کچھ اعتراف فرماؤ
وگرنہ میری خطا کو معاف فرماؤ

خراب کس لئے کرتے ہو، ہم غریبوں کو
نہیں نباہ کی نیت تو صاف فرماؤ

جنابِ شیخ یہ خوشبو تو کچھ عجیب سی ہے
وہ کیا دھرا ہے درونِ غلاف فرماؤ

پڑے ہو حجرۂ مسجد میں کیوں پریشاں سے
کسی حسین جگہ اعتکاف فرماؤ

یہ بزمِ حشر بھی ٹھہری تمھاری ملکیت
یہاں بھی جانِ عدم انحراف فرماؤ

دیکھ کر صورتِ آرام اُتر آئی ہے
زندگی خود ہی تہِ دام اُتر آئی ہے

میرے پیمانۂ احساس کے اندر ساقی
تیری تصویرِ سرِ شام اُتر آئی ہے

میں نے اک لمحہ ہٹائی ہے اِدھر سے جو نظر
جام میں گردشِ ایّام اُتر آئی ہے

دِل کی تنہائی میں کس سمت سے معلوم نہیں
ایک دوشیزۂ گلفام اُتر آئی ہے

اب تو شیشے کو کرو رنگ سے لبریز عدمؔ
شام کی شرط تھی، لو شام اُتر آئی ہے

رُخ بدل سکتے ہیں انداز بدل سکتے ہیں
ساز بچھڑ تو نہیں، ساز بدل سکتے ہیں

نَے کے ہر پردے کا مفہوم الگ ہوتا ہے
آپ چاہیں تو ہم آواز بدل سکتے ہیں

اک ذرا آپ کی آنکھوں کا ہے ایما لازم
حادثے صورتِ آغاز بدل سکتے ہیں

باغباں تجھ کو قلق ہے تو بتا دے ہم کو
ہم ابھی نیّتِ پرواز بدل سکتے ہیں

تجھ کو ہے ان کی رفاقت پہ بھروسہ بیجا
اے عدمؔ ہمدم و دمساز بدل سکتے ہیں

تکلفات کے دریا بہا کے ملتے ہیں
ہمیں تو لوگ بہت مسکرا کے ملتے ہیں

غضب تو یہ ہے میں شکوہ بھی کر نہیں سکتا
ستم تو یہ ہے وہ آنکھیں ملا کے ملتے ہیں

بڑے لطیف غموں کا سبو کھنکتا ہے
بڑے حسین نتیجے دعا کے ملتے ہیں

ابھی شرابِ محبت کی بو نہیں بھڑکی
ابھی عدم وہ نگاہیں چرا کے ملتے ہیں

کسی کو دشت کی تنہائیوں میں نیند آتی ہے
کسی کو باغ کی رعنائیوں میں نیند آتی ہے

بہاریں خواب کرتی ہیں مگر قوسِ قزح بن کر
جوانی کی جواں انگڑائیوں میں نیند آتی ہے

پیالے کی کھنک سے مست ہو جاتا ہے غم ایسے
کہ جیسے سانپ کو شہنائیوں میں نیند آتی ہے

مجھے ساحل کے سناٹے سے راحت مل نہیں سکتی
مجھے طوفان کی گہرائیوں میں نیند آتی ہے

ندیمؔ فرہاد و شیریں کے محل میں سو نہیں سکتا
گدا کو شہر کے ہرجائیوں میں نیند آتی ہے

•

روشن ہے شمعِ حُسن کا بازارِ شام سے
پروانے جل رہے ہیں بڑے اہتمام سے

لمحہ اگر دوام سے کچھ مختلف نہ ہو!
لمحہ عظیم تر ہے حیاتِ دوام سے

جب دل ہُوا اُداس ترا نام لے لیا
کتنی عقیدتیں ہیں اس میں تیرے نام سے

کچھ اور کھُل رہی ہیں حدیں کائنات کی
انگڑائی لے رہے ہیں وہ اس اہتمام سے

نشّہ طلوع ہوتا ہے صہبا سے اے عدمؔ
خنجر نکل رہا ہے غلافِ نیام سے

O

الٰہی بے خودیِ عشق پر اماں گزرے
مری نظر سے نہ اُن کو کوئی گماں گزرے

ٹھہرنا کیا تھا کسی بے وفا کے کوچے میں
اُداس اُداس گئے تھے تپاں تپاں گزرے

ہے نوکِ خار بھی ابرشتے یار کی صورت
کہاں کہاں سے بہاروں کے کارواں گزرے

ہزار بجلیاں آآ کے ہوگئیں واپس
ہزار حادثے نزدیکِ آشیاں گزرے

اداس اداس بہارو! اب مجھے خبر کرنا
سیہ لباس میں جب شہرِ خزاں گزرے

ہیں اب بھی یاد میں محفوظ چاندنی کی طرح
وہ چند لمحے جو یاروں کے درمیاں گزرے

چلے نہ تھے تو بڑی سوچ میں تھے غرق عدم
ہوئے رواں تو مسافر کشاں گزرے

نہ جانے اس میں خرامِ بہار ہے کب کا
تمہاری زلفِ مسلسل وقار ہے شب کا

ہے سلسبیل میں بھی چاندنی اسی شئے کی
گیا ہے روپ کہاں تک شراب کی چھب کا

گماں یہ ہے کہ اتالیق تھا نہ طفل کوئی
چراغِ رات کو روشن نہیں تھا مکتب کا

فقیر کی یہ دعا ہے خلوصِ نیّت سے
کریم اپنے کرم سے بھلا کرے سب کا

شرابِ ناب اگرچہ شرر نہیں تاہم
معاملہ ہے ترے نازک و حسیں لب کا

ہے زبیستوں کی ریا وہ شدید ہر عدم
جلا ہے جس سے کئی بار نیش عقرب کا

ساقی رضا کی بات نہ رغبت کی بات ہے
سب تیرے التفات و عنایت کی بات ہے

مشکل ہے بات زہرہ جبینوں سے خلق کی
ہو جائے ہمنشیں تو کرامت کی بات ہے

جو بات چاہتی ہیں حسینوں کی کاکلیں!
وہ بات تو فراغت و فرصت کی بات ہے

ہے آپ کے ستم سے مراد آپ کا کرم
یہ بات ہے تو کتنے مسرت کی بات ہے

مت کھینچ ہاتھ جور سے او کم نگاہ اب
یہ بات بھی شدید ضرورت کی بات ہے

مطرب یہ دلکشی جو ترے زمزمے میں ہے
یہ تو ہمارے حُسنِ سماعت کی بات ہے

مجبور تو کوئی نہیں کرتا حضور کو
یہ تو حضور شوق و طبیعت کی بات ہے

دیتے ہیں آپ ہم کو جو اتنی اذیتیں
یہ آپ کے خلوصِ محبت کی بات ہے

جنت میں میکشی کے لئے جا رہے ہیں آپ
یہ تو جنابِ شیخ قباحت کی بات ہے

احباب کر رہے ہیں جو اتنے خلوص سے
میرا خیال ہے کہ نصیحت کی بات ہے

مجھ کو یہ تیری بات پسند آئی ہے عدمؔ
سب اپنے اپنے حُسنِ عقیدت کی بات ہے

میری آنکھوں سے کچھ اُس آنکھ کی یوں بات ہوئی
جیسے دو بادہ گساروں میں ملاقات ہوئی

گر کے جب جام کسی ہاتھ سے کوئی ٹوٹا!
مشتعل اور بھی کچھ نبضِ خرابات ہوئی

میں تو تھا گرمِ سفر جانبِ کعبہ لیکن!!
راہ میں اور ہی صورتِ حالات ہوئی

چرخ پر کوئی ستارہ ہے نہ جنگل میں چراغ
دشتِ ہستی کے مسافر کو کہاں رات ہوئی

یوں عقدۂ زلف وہ در آئی خیالوں میں مرے
جیسے تپتے ہوئے صحراؤں پہ برسات ہوئی

Allama Iqbal Library
109173

K UNIVERSITY LIB
Acc No 109173
Date 17. 2. 76

کیا ہے اُس روئے مرمریں کا جواب
چہرہ چہرہ ہے اور کتاب کتاب

ڈر مجھے لگ رہا تھا محشر میں
ہو گیا شیخ کا حساب کتاب

دِل ہیں کچھ بٹے ہوئے حضور حضور!
دیکھیے کر رہا ہے حجاب بحجاب

آگ تھی یا صدا تھی نغمے کی!
جل گیا کس طرح وجودِ رباب

مجھ سے مفہومِ زیست مت پوچھو
ٹوٹ جائے نہ گر کے جامِ شراب

اِس طرح جام ہاتھ میں آیا
گر پڑے جیسے چرخ سے مہتاب

وہ تو فرمائیے ذرا کھل کر
لطف ہوتا ہے جو بہ طرزِ عتاب

ہائے وہ زلف ہائے وہ سینہ
جھنگ میں جیسے بہ رہا ہو چناب

ہرنیاں بن گئیں مینا جاتیں
چھا گیا جنگلوں پہ ہیر کا خواب

زیرِ دستاں بھی نہیں چھُٹتی
کس قدر نامراد شے ہے شراب

ہائے کتنے حسین ہیں وہ عدم
آئینے سے بھی کر رہے ہیں حجاب

کاتب سرور صدیقی

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN.